

کعبے کا امام

امام مکے سے آیا تھا اور نماز ملتان میں پڑھی جا رہی تھی، ہر طرف سر ہی سر تھے اور ہر جگہ صفیں ہی صفیں۔ مدرسے کی وسیع مسجد اور اس سے ملحق بہزہ زار بھی، کھلا میدان بھی اور روشیں بھی..... حتیٰ کہ مدرسے سے باہر کی سڑکیں بھی، صف بستہ نمازیوں سے پُر تھیں۔ امام صاحب نے اس دن مغرب کی پہلی دو رکعتوں میں، قدرے طویل تلاوت کی تھی لیکن مغرب کی نماز کو آخر کتنا طویل ہونا تھا؟ نماز ختم ہو گئی۔ ایک کیفیت ختم ہو گئی۔ یوں لگا کہ سماعت کو ایک سرور اور دل کو ایک دھڑکن بس چند منٹ کے لیے ودیعت ہوئی اور پھر کھو گئی۔

آج اخبار میں خبر پڑھی کہ شیخ علی جابر، اللہ کو پیارے ہو گئے تو زبان سے بے اختیار نکلا ”انا للہ وانا الیہ راجعون“۔ ذہن میں یکا یک ایک تصویر سی چمک اٹھی۔ ۷۱ سال پہلے کی وہ نماز ہمیں بہت یاد آئی جو شیخ علی عبداللہ بن علی جابر کی اقتدا میں خیر المدارس ملتان میں ۱۹۸۸ء میں ادا کی گئی تھی۔ تب وہ امام کعبہ تھے۔

حرم مکہ کے موجودہ ائمہ میں سے شیخ عبدالرحمن السدیس اور شیخ سعود الشریع اپنے اپنے منفرد لہجوں سے گویا گوشِ سماعت اور گوشِ دل کے فاصلے مٹا دیتے ہیں۔ لیکن اس سال رمضان میں شیخ صلاح البدیر اور شیخ عبداللہ عواد الجبنی، مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ بلائے گئے۔ تراویح اور قیام کے لیے۔ مدینہ والوں کو ان کا بلایا جانا اچھا تو نہیں لگا لیکن حرم مکہ کے نمازیوں کے لیے رمضان کی یہ راتیں پہلے سے کہیں بڑھ کر یادگار اور پر کیف رہیں۔ آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی، سسکیوں میں دبی ہوئی اور تاثیر سے بھری ہوئی۔ صلاح البدیر، قدم قدم پر رو دیتے ہیں، بالکل یوں جیسے بچے بے تابانہ بلکتا ہے۔ اور عبداللہ الجبنی، جوان بلکہ نوجوان، پڑھتے نہیں بہتے ہیں۔ ایسا بہاؤ جس میں عجز، مسکنت، حلاوت، سکینت اور نجانے کیا کچھ سننے والوں کو بہائے لیے جاتا ہے۔

شیخ علی جابر کی وفات کا سنا تو دل میں وہ جو ایک امید سی تھی کہ شاید کبھی ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا ایک بار پھر نصیب ہو، وہ امید دم توڑ گئی۔ ادھر ملتان میں تھا تو حبیب گرامی، مولانا حبیب الرحمن ہاشمی حفظہ اللہ کی تلاوت میں شیخ علی جابر کی طرزِ ادا کا عکس سا دیکھا کرتا تھا۔ تجوید میں نے سیکھی نہ پڑھی، لیکن یونہی ایک دلچسپی سی پیدا ہو گئی۔ نتیجہ یہ کہ اپنی محرومی کا احساس بھی پیدا ہوا۔ اور یہ احساس گرد و پیش پر نظر کرتے اور شدید..... اور گہرا ہو جاتا ہے۔ قرآن کا پڑھنا، ترتیل کے ساتھ پڑھنا، لہجوں عرب میں پڑھنا اور حضور قلب سے پڑھنا..... افسوس ان میں سے ایک ایک لغت پر زوال آرہا ہے، اور ہم اپنے زوال کی نشانیاں نجانے کہاں ڈھونڈ رہے ہیں؟

ایک لطیفی کی بات یاد آگئی۔ کچھ روز ہوئے ایک دوست کے یہاں بیٹھا تھا۔ ٹی وی پر کوئی ہندوستانی چینل چل رہا تھا۔ ایک پروگرام پیش کیا گیا..... ”استاد بسم اللہ خان“ پر۔ استاد، اس وقت ہندوستان کے سب سے بڑے شہنائی نواز ہیں۔

نگارشات

اشاعت خاص بیاد: سید ذوالکفل بخاری

ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان

بہت بوڑھے، چہرے پر جھریاں، وجود اکہرے سے بھی کچھ کم۔ لیکن آنکھوں میں چمک، بدن میں چستی اور سانس پر تو ایسا قابو کہ دیکھنے والے کا سانس، جسے دیکھ کر ہی رک جائے۔ استاد نے بہت سی باتیں کیں۔ فن موسیقی پر۔ اس کی مشرقی اور کلاسیکی روایت پر۔ لیکن ان کا سب سے زیادہ زور اس بات پر تھا کہ سپاسر، سچے من سے پھوٹتا ہے۔ ریاضت اپنی جگہ، لگن اپنی جگہ لیکن..... دل و نظر جو ”مسلمان“ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ پھر استاد نے ”سارے گا ماما.....“ کو الٹ پلٹ کر عجیب پر سوز انداز میں دو چار بار گایا۔ اچانک بولے، اب سنئے۔ کیا ارے..... استاد نے کہا ”اللہ جل جلالہ“ کہا نہیں..... گایا۔ جم کر اور ڈوب کر۔ ایک بار، دوبار، تین بار۔ اور واقعہ یہ ہے کہ استاد کی آواز سننے والے کے پورے وجود میں سرایت کر رہی تھی۔ مجھے اس وقت ماموں سید عطاء الحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ بہت یاد آئے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ سانس روکنے اور کھینچنے کی کیفیات میں اللہ کا ذکر، ہمارے تصوف میں ہندوؤں کے یہاں سے آیا ہے۔ بول، بندش، راگ، راگنی، سُر، تال، خیال..... غرض موسیقی کو کتنی ہی جہتوں سے ”مسلمان“ بنانے کی کوششوں میں ہم نے سلوک و تصوف کو ”موسیقیا“ دیا۔ ایک اہم حوالہ، اس ضمن میں، وہ قاری محمد طاہر قاسمی رحمۃ اللہ علیہ (قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی) کی کسی کتاب سے ہمیشہ دہرایا کرتے تھے۔ مجھے وہ حوالہ متحضر نہیں، البتہ کتاب کا دیکھنا خوب یاد ہے۔

عام ائمہ مساجد کا کیا کہنا، ہمارے ہاں اچھے اچھے فارغ التحصیل مولوی صاحبان کو، اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرماویں، نہیں معلوم کہ تلاوت قرآن کی ”لذت“ کیا ہوتی ہے۔ وہ کونسا نور ہے جو کانوں کے راستے سے دل میں، اور دل سے پورے وجود انسانی میں سرایت کرتا ہے۔ گستاخی معاف! بڑے بڑے دھواں دار بلکہ دھاری دار خطیب، مقرر اور واعظ ہمارے یہاں قرآن کو مجہول پڑھتے ہیں۔ اور بد آوازی؟ سننے والوں کے لیے یہ ایک ”دردناک عذاب“ ہے جو مترازد ہے۔ وعظ و فوٹوں اور خطابتی سوداگروں میں البتہ کچھ ایسے بد نفس بھی ہوتے ہیں جو باقاعدہ راگوں راگینوں میں تلاوت قرآن کرتے ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں، میری ملازمت لیہ میں تھی۔ وہاں ایک صاحب ہمارے ساتھ ہی ملازم تھے۔ تعارف بڑھا تو معلوم ہوا کہ آپ کلاسیکی موسیقی سے خصوصی علاقہ رکھتے ہیں۔ ایک رافضی مولوی نے ان سے باقاعدہ راگ سیکھے اور پھر راگ میں تلاوت کی مشق کی۔ پھر موصوف نے ”مجلس خوانی“ میں ”تلاوت“ سے زُلا دینے کی شہرت پائی اور ”حافظ صاحب“ کہلائے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ”آداب تلاوت تو بہت ہیں مگر میں ایک ہی ادب بیان کرتا ہوں جس میں سب آجائیں۔ یوں خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ تم پڑھو، ہم سنتے ہیں۔ تب یقیناً سنوار کر پڑھے گا“۔ جس چیز کو حضرت نے سنوار کر پڑھنا فرمایا، اس میں سرزمین مصر کا اپنا ایک امتیاز ہے۔ سال بھر ہوا۔ ایک روز شام (Syria) کے ایک قاری صاحب کو، شام ہی کے ٹی وی سے تجوید کا پروگرام پیش فرماتے دیکھا۔ انھوں نے تجوید کے بعض قواعد و قوانین اور کلیات و ضوابط کی وضاحت بھی کچھ فرمائی، (یہ ایک سلسلہ وار پروگرام تھا) لیکن ایک بات کو خصوصاً واضح فرمایا، اور یہ وہی بات تھی جس کی طرف ہمارے یہاں توجہ کم کم ہے۔ یعنی..... طرز ادا۔ انھوں نے اس کے لیے ”نغم“ (نغم غم) کا لفظ استعمال فرمایا، جس کی جمع انغام اور اناعیم آتی ہے۔ جس خوبی سے اور عملی مشق سے انھوں نے مصر کے اکابر اور مشائخ قراء کے لہجوں کی اور لحن کی وضاحت فرمائی، وہ دیدنی بھی تھی اور شنیدنی بھی۔ عبدالباسط، محمد صدیق المنشاوی، مصطفیٰ اسماعیل اور ان سے بھی پہلے محمد رفعت اور عبدالفتاح شعشعی وغیرہم (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) کی تلاوتیں سن کر دل پر جو چوٹ پڑتی ہے، اُس کے کئی بھید اس روز کھلے۔ فن کے اسرار اور نزاکتیں کھلیں۔ افسوس ان قاری صاحب، جو خاصے بزرگ لیکن بہت

پروم تھے، کا نام بھول گیا۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ تجوید ہرگز ہرگز میرا میدان نہیں۔ لحن خفی، لحن جلی، یا..... اظہار، انخفاء، تقحیم، ترقیق وغیرہ کی مجھے ہوا بھی نہیں لگی۔ ہاں البتہ کچھ ایسی آوازیں تلاوت کی، ضرور ان کانوں نے براہ راست سنی ہیں کہ اب ان سے بہتر آوازیں شاید ہی سننے کو ملیں۔ مثلاً قاری عبدالوہاب العوفی المکی رحمۃ اللہ علیہ جو ماموں سید عطاء الحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور سید عطاء المبین بخاری مدظلہ کے استاد تھے اور امام القراء حضرت قاری عبدالملک رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے کے نمائندہ بزرگ تھے۔ ماموں عطاء الحسن بخاری علیہ الرحمۃ، خود قاری عبدالملک رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ وہ بتلایا کرتے تھے کہ قاری صاحب مجھے فرماتے ”آواز کو پھینکنا سیکھو، جیسے تمہارے ابا پھینکتے تھے“۔ اور پھر جنھوں نے سید عطاء الحسن بخاری علیہ الرحمۃ کو سنا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ آواز کا یہ ”پھینکنا“ قدرت کا ان پر ایسا انعام تھا، جس میں وہ لاکھوں نہیں، کروڑوں میں ممتاز تھے۔ آواز میں رس، رچاؤ، بلندی، کراہین، طاقت اور دم..... یہی ان کی طرزِ ادا اور ان کا ”نغم“ تھا۔ ان کے معاصرین کا کہنا تھا کہ یہ خاص قاری عبدالملک صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رنگ تھا۔ نانا بابا (امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری علیہ الرحمۃ) کو میں نے سنا نہیں۔ لیکن اتنا تو معلوم ہی ہے کہ ان کے استاد شیخ عمر عاصم رحمۃ اللہ علیہ، عرب تھے۔ خود قاری عبدالملک صاحب، جو بلاشبہ اپنے عہد کے امام القراء تھے، فن کی یہ سوغات لینے لکھنؤ سے مدرسہ صدیقیہ مکہ مکرمہ پہنچے اور فائز المرام لوٹے۔ ان کے بھائی حضرت قاری عبدالخالق صاحب بھی ہمراہ تھے۔ ادھر حضرت قاری رحیم بخش پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی تینوں ماموؤں کو (سیدنا الامام ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو چھوڑ کر) خیر المدارس میں شرفِ تلمذ ملا۔ یہ ایک دوسرا سلسلہ الذہب تھا۔ جس کی طرزِ ادا قاری محی الاسلام عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور قاری فتح محمد پانی پتی (مہاجر کی) رحمۃ اللہ علیہ سے ہوتی ہوئی حضرت قاری رحیم بخش صاحب رحمہ اللہ تک پہنچی تھی۔

میں نے سوچا تھا کہ شیخ علی جابر رحمہ اللہ کی وفات پر ایک شذرہ لکھ کر ”نقیب ختم نبوت“ کے لیے بھجوا دوں۔ لیکن یہ تحریر پھیلتی چلی گئی۔ اس کا مزید پھیلاؤ روکنے کی تدبیر نہ کی تو ڈر ہے کہ یہ ایک سروپا قسم کا ”مقالہ“ بن جائے گا۔ جبکہ ایسے مقالے لکھنے کے لیے پی ایچ ڈی یا ایم فل وغیرہ کا عنوان آج کل ضروری سمجھا جاتا ہے۔ باتیں تو بہت سی ہیں، لیکن اس تحریر کو چند سطروں میں سمیٹتا ہوں۔

شیخ علی جابر مرحوم کا پڑھنا، سید عطاء الحسن بخاری رحمہ اللہ کو پسند تھا۔ انھیں شاید علم نہ ہو سکا کہ شیخ، انہی کے سلسلے میں نسبتِ تلمذ رکھتے تھے۔ یہ بات یہاں آکر معلوم ہوئی کہ مدینہ طیبہ میں مقیم قاری محمد ظلیل صاحب حفظہ اللہ (جو اب سعودی ہیں) شیخ علی جابر کے استاد ہیں۔ جبکہ قاری صاحب، قاری محمد شریف صاحب رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔ اور وہ شاگرد تھے قاری عبدالملک کے۔

علی جابر ۵۳ سال کی عمر میں ۱۴/ دسمبر (۲۰۰۵ء) کو چل بسے۔ وہ مدینہ یونیورسٹی اور جدہ کی ملک عبدالعزیز یونیورسٹی میں استاد رہے۔ شاہ خالد مرحوم کے امام خاص رہے۔ اب ایک طویل عرصے سے بیمار تھے۔ آخر، یہ بیماری دائمی صحت اور جاودانی زندگی کے نئے سفر میں، مرحوم کا ساتھ چھوڑ گئی۔ سفرِ زیست کی کہانی کا ایک باب مکمل ہوا اور نیا باب نئے ورق سے شروع ہو گیا۔ ایک چھوٹا سا ورق ادھر پاکستان میں، میرے ”گورستانِ کتب“ میں بھی ضرور کہیں دبا ہوا پڑا ہے، جس پر شیخ علی جابر کے دستخط ثبت ہیں۔ بس ایک یاد۔ آٹو گراف کا بس ایک صفحہ۔ اور کچھ بھی نہیں۔